ROLE OF MEDIA AND EDUCATION IN THE DILEMMA BETWEEN RELIGIOUS AND NON RELIGIOUS POWERS IN PAKISTAN. AN OVERVIEW.

پاکستان میں دینی اور لادینی قوتوں کے مابین کشمکش میں نظام تعلیم اور میڈیا کا کردار: ایک جائزہ

SALMA KANWAL
Research Secular

fatimakanwal958@gamil.com

ABSTECT

There are two groups which are found in Pakistan, one group with religious mind and the other with secular mind. The group with religious mind set and Islamic scholars want the implement and dominancy of Islamic principles and laws in this country. In Pakistan's Parliament and judiciary, most of the people are of secular mind set, and have been educated from secular institutions. Therefore, the laws passed and interpreted here are according to secularism, because they want to turn it into a modern state. On the other hand, Islamic scholars and the group with religious thoughts, want the laws and interpretations of laws to be completely in accordance to the principles of Islam, but due to their minority in parliament, judiciary etc, they does not face success in this implementation, though this group ismuch more in number than the secular group, in Pakistan. In this article, we have discussed the above mentioned situation and the role of media and secular education in this situation.

KEY WORDS

Education, MEDIA, religious, Islamic principles

تعارف:

اس میں کوئی شک نہیں کہ برصغیر کے مسلمانوں نے اپنے مسلم تشخص کے سبب پاکستان حاصل کیا تھا اور علما ہی نہیں عوام کی بھاری اکثریت بھی یہ خواہش رکھتی تھی کہ یہاں کا ریاستی نظام قرآن وسنت کی روشنی میں ہی ترتیب دیا جائے مگر ایک طویل عرصہ گزر جانے کے باوجود آج بھی یہ خواہش صرف خواہش ہی ہے جب کہ ماضی کے مقابلے میں اب لادینی قوتوں کی جانب سے اسلامی قوانین کے نفاذ کے خلاف کھل کر اظہار خیال بھی کیا جانے لگا ہے یوں دینی اور لادینی قوتوں کے درمیان ایک کشمکش ہے جس میں سیکولر نظام تعلیم اور میڈیا کے کردار کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا اس حوالے سے زیر نظر مقالے میں ان وجوہات کا ایک جائزہ لیا جا رہا ہے کہ لادینی قوتوں کا اس ملک میں غلبہ کیوں بڑھتا جا رہا ہے اور اب تک اس ملک میں قرآن وسنت کی حکمرانی قائم نہیں ہو سکی۔

میڈیا؛ اس سے مراد وہ میڈیا ہے جو عوام الناس کی دسترس میں ہے مثلاً ریڈیو، ٹی وی، اخبارات وغیرہ

سیکولر نظام تعلیم؛

اس سے مراد وہ نصاب تعلیم اور نظام ہے جو مغرب کے معاشرے میں رائج ہے اور کسی حد تک ہمارے ملک میں بھی سرکاری اور نجی تعلیمی اداروں رائج ہے۔

لادینی نظریات کیا ہیں؟:

زیر نظر موضوع کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ پہلے یہ سمجھ لیا جائے کہ لادینی نظریات کیا ہیں۔ سترھویں اور اٹھارویں صدی میں عیسائیت کے خلاف بغاوتیں شروع ہوئیں جن کو تنویریت کہتے ہیں، ان کے معروف مفکرین میں جان لاک، کانٹ، ڈسکارٹ، ہیگل اور مارکس وغیرہ شامل تھے۔ یہ تمام مفکرین مختلف نظریات رکھنے کے باوجود اس بات پر متفق ہیں کہ انسان 'ہیومن بینگ' ہے۔ اس سے ان کی مراد یہ ہے کہ ایک انسان کسی کا بندہ نہیں وہ خود احد وصمد ہے، اس کو حق ہے کہ وہ خیر اور شر کا تعین خود کرے مذہب کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ خیر اور شر کا تعین کرے۔ ان عقائد پر ایمان لائے بغیر انسان 'ہیومن بینگ' نہیں بن سکتا اور جو انسان 'ہیومن بینگ' نہیں وہ تنویریت کے نظام اجتماعی کا رکن نہیں بن سکتا اور نہ ہی اسے 'ہیومن رائٹس' حاصل ہو سکتے ہیں۔ یوں 'ہیومن بینگ' کے تحت جو نظام قائم ہوتا ہے اس کو دستوری جمہوریت کہتے ہیں اور اس نظام میں اقتدار شہریوں کو حاصل ہوتا ہے کہ وہ ان لادینی یا سیکولر نظریات پر نظام چلانے کے لیے جو اصول اور قوانین چاہیں وضع کریں، شرط صرف یہ ہے کہ یہ اصول اور قوانین آزادی کے فروغ، تسخیر کائینات اور حق خود اختیاریت کے حصول کا ذریعہ ہوں۔ اس نظام میں سیکولرازم کے لیے دو گنجائشیں موجود ہیں ایک یہ اصول قبول کرنا کہ مذہب ایک انفرادی معاملہ ہے جس کا اجتماعی نظام میں کوئی عمل دخل نہیں مثلاً یہ کہ ہر شخص کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ شراب نہ پیئے، یہ اس کا حق ہے لیکن اگر کوئی دوسرا شراب پیتا ہے تو اس کو روکا نہ جائے گا، والدین بھی

اس کو روک نہیں سکتے کیونکہ اس کا شراب پینے کا حق 'ہیومن رائٹس' میں آتا ہے۔ دوسری گنجائش یہ ہے کہ ہر شخص کو اس بات کا حق ہے کہ وہ اپنے مذہب کے حوالے سے جو چاہے تشریح پیش کرے۔(1)

سیکولرازم اس بات پر نہایت شدومد سے زور دیتا ہے کہ ایک عادلانہ معاشرتی نظام کے لیے ہمیں انسانیت کی سطح پر سوچنے کی ضرورت ہے نہ کہ کسی خاص مذہب، رنگ و نسل وغیرہ کی بنیاد پر۔ یعنی معاشروں کی بنیاد ایسی قدر پر استوار ہونی چاہیے جو ہم سب میں مشترک ہے اور وہ اعلیٰ ترین اور بنیادی قدر مشترک شئے ان کے نزدیک 'انسانیت' کے سوا کچھ نہیں ہو سکتی۔ سیکولر حضرات اپنے دعوے کی معقولیت ثابت کرنے کے لیے یہ سوال اٹھاتے ہیں کہ 'آیا پہلے اصلاً ہم انسان ہیں یا مسلمان؟' جواب میں جب یہ کہا جاتا ہے کہ ہم پہلے انسان ہیں تو پھر ثابت کیا جاتا ہے کہ ہماری اصل انسانیت ہے نہ کہ مسلمانیت۔ یہی وہ تصور ہے کہ جس کہ ذریعے سیکولرازم مذہب کو فرد کا نجی مسئلہ بناڈالتی ہے کیونکہ انسانیت کو اصل قرار دینے کے بعد زیادہ معقول بات یہی دکھائی دیتی ہے کہ اجتماعی نظالم کی بنیاد ایسی شئے پر قائم کی جائے جو سب کی اصل اور سب میں مشترک ہو تا کہ زیادہ وسیع النظر معاشرہ وجود میں آسکے۔ انسان کی اصل انسانیت قرار دینے کے بعد مذہب کا نجی بن جانا ایک لازمی منطقی نتیجہ ہے اور یہی نقطہ تمام سیکولر ہائے زندگی (چاہے وہ لبرل ازم ہو یا اشتراکیت) کی اصل بنیاد ہے۔ اسی فکر کے نتیجے میں ہم اس قسم کے جملے سنتے ہیں کہ 'ہمیں انسانیت کے پیمانے پر سوچنے کی ضرورت ہے' یا 'سب کے نظریات وخیال لات کو عزت کی نگاہ سے دیکھنا چاہیے کیونکہ سب لوگ انسان ہیں' وغیرہ۔ سوال یہ ہے کہ اگر میں انسان نہیں ہوتا تو کیا ہوتا؟ فرض کریں حیوانات، نباتات یا جمادات میں سے ہوتا تو تب بھی میں مخلوق ہی ہوتا یعنی اپنے وجود کی ہر ممکنہ صورت میں میری اصل مخلوق (عبد) ہونا ہی ہوتی۔ جب یہ ثابت ہو گیا کہ میری حقیقت عبد ہونا ہے اور انسانیت محض میری عبدیت کے اظہار کا ذریعہ ہے تو یہ سمجھنا بالکل آسان ہو گیا کہ میری انسانیت کا وہ اظہار معتبر ہو گا جس میں عبدیت جھلکتی ہو نہ کہ میری خود کی مرضی اور نفس پرستی۔ چونکہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک میری عبدیت کے اظہار کا واحد معتبر ذریعہ صرف اور صرف اسلام ہے لہٰذا میری انسانیت معتبر تب ہی ہو گی جب میری زندگی کا ہر گوشہ اسلام کے مطابق ہو۔(2)

مذکورہ بالا لادینی نظریات مغرب سے نکل کر ہمارے ہاں بھی نہ صرف وارد ہو گئے بلکہ سیکولر نظام تعلیم اور میڈیا کے سبب تیزی سے پھیلنے لگے اور ان کے شکار وہ لوگ ہوئے جو ملکی اور بین الاقامی سطح پر تعلیم حاصل کرنے اور مغربی ماحول میں رہنے کے سبب مغرب کی ترقی سے متاثر ہوئے اور ان کے لادینی نظریات کو بھی اچھا سمجھنے لگے۔ ملک کے اندر بھی اعلیٰ سیکولر تعلیمی اداروں میں پڑھنے والے بھی ان نظریات سے متاثر ہوئے اور پھر میڈیا سے بھی لوگوں کی ایک بڑی تعداد متاثر ہونے لگی کیونکہ میڈیا بھی روشن خیالی اور لادینی نظریات کو فروغ دیتا ہے۔ چنانچہ ایک خاص طبقہ جو پڑھا لکھا بھی تھا اور مغربی طرز تعلیم سے بہرہ مند ہو چکا تھا اور یہی طبقہ ملک کے اعلی اداروں خاص کر پارلیمنٹ تک پہنچ چکا تھا لہٰذا ان کے لادینی نظریات اور تربیت اس ملک میں اسلامی نظام یا قوانین کے نفاذ میں رکاوٹ بننے لگی۔

دوسری طرف قیام پاکستان کے فوراً بعد سے ہی دینی قوتوں نے اس ملک میں اسلامی قوانین کے نفاذ کے لیے اپنے اپنے نقطہ نظر سے حکمت عملی اپنائی اور کوششیں کیں مگر انھیں خاطر خواہ کامیابی نہیں ہوسکی۔ اس سلسلے میں مختلف اہل دانش کچھ اس طرح روشنی ڈالتے ہیں۔

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ پاکستان کے آئین میں یہ آرٹیکل موجود ہے کہ جس کے تحت قرآن وسنت کے خلاف قانون سازی نہیں کی جاسکتی، بعض لوگوں کا خیال اس کے قطعی برعکس ہے۔ اس ضمن میں مولانا محمد زاہد مغل کہتے ہیں کہ

"قرارداد مقاصد ہو یا 1973 کا دستور، یہ شقیں تو ریاست کو کافرانہ نظام کے ماتحت چلانے کا بہانہ ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ یہ شقیں ہمیشہ طاق نسیاں پر پڑیں رہتی ہیں اور ہمارے ملک میں بے شمار قوانین خلاف شرع ہونے کے باوجود پچھلے 34 برسوں سے عدلیہ ٹس سے مس نہیں ہوئی بلکہ اس کے بجائے جب کبھی کوئی اسلامی قانون نافذ کرنے کے معاملات پیش آئے تو اس کی راہ میں رکاوٹیں کھڑی کرتی رہی ہے جیسا کہ سود کے خلاف قانون اور حسبہ بل کے معاملات میں دیکھا گیا۔ اس اسلامی نما شقوں کی حیثیت صرف اتنی ہے کہ انہیں خود 'ہم نے' دستور میں رکھا ہوا ہے اور اگر 'ہم' چاہیں تو انہیں ختم بھی کرسکتے ہیں، گویا اصل حاکمیت 'ہماری' ہی ہے۔ پھر ان شقوں پر مبنی عدالت عظمیٰ چاہے تو رد کرسکتی ہے، گویا اصل حاکمیت تو دستوری قانون ہی کی ہوگی اور شارع کی بات بس ایک مشورے کے طور پر کہی اور سنی جاسکتی ہے۔"(3)

فلسفہ کے ایک پروفیسر کے خیال میں:

"انیسویں صدی کے اواخر سے برصغیر پاک وہند کی تحریکات اسلامی کو جن مختلف چیلنجز کا سامنا کرنا پڑا ان میں سیکولرازم بھی ایک اہم چیلنج رہا ہے۔ اللہ کے فضل وکرم سے تحریکات اسلامی نے علمی سطح پر سیکولرازم کا جم کر مقابلہ کیا اور امت کے علمی سرمائے کے تحفظ کا فریضہ بہ احسن وخوبی ادا کیا۔ لیکن اس کے باوجود بھی سیکولرازم اپنی گرفت آہستہ آہستہ مضبوط کرتا جارہا ہے۔ تحریکات اسلامی نے روشن خیالی سے اخذ کردہ سیاسی، سماجی، قانونی اور معاشی ڈھانچوں (جو کہ نامیاتی طور پر سیکولر نوعیت کے نظام کی بنیاد فراہم کرتے ہیں) میں شرکت کے ذریعے ان ڈھانچوں کو اسلامیانے کی کوشش کی۔ ان جوہری طور پر سیکولر ڈھانچوں کی اسلام کاری کے عمل میں تحریکات اسلامی سے وابستہ افراد کامیاب ہوئے ہوں یا نہ ہوئے ہوں لیکن اس نظام میں راسخ العقیدہ علماء حق کی شرکت سے معاشرتی، سیاسی، معاشی اور قانونی نظام کی سیکولرائزشن کو اسلامی جواز ملنا شروع ہوگیا۔"(4)

پاکستان میں اسلامی قوانین کے نفاذ کے ضمن میں اہل دانش میں یہ نقطہ بھی پیش کیا جاتا ہے کہ "قیام پاکستان سے قبل احیائے جہاد کے لیے علمائے اکرام نے بے مثال قربانیاں دیں۔ اس دور میں بنیادی مقصد انگریز کے نظام کو تہس نہس کرنا تھا اور اسلامی ریاست کے قیام کو ممکن بنانا تھا۔ اس مقصد کے لیے ایک طرف مدارس کا جال پھیلایا گیا تاکہ اسلامی علمیت اور اسلام کے علمی سرمائے کا تحفظ کیا جاسکے اور دوسری طرف اسلامی ریاست کے قیام کے لیے برصغیر کے مختلف حصوں میں تحریکات برپا کی جاسکیں۔ لیکن پے در پے ظاہری ناکامیوں کے بعد خصوصاً 1924 میں تحریک خلافت کی ناکامی کے بعد اسلامی ریاست کے قیام کو ایک ناقابل ہدف کے طور پر علماء نے قبول کرلیا۔ اس کے بعد سیکولر جماعتوں مسلم لیگ اور کانگریس سے اشتراک عمل، دستوری وجمہوری ذرائع کا استعمال ہماری دینی جماعتوں کا عام طریقہ بن گیا۔ وہ جماعتیں جن کی فکر کا بنیادی

محور احیائے جہاد تھا انھوں نے بھی قیام پاکستان کے بعد ریاستی جدوجہد کے لیے جو نظریہ تشکیل دیا وہ یہی تھا کہ ہم دستور پاکستان کے اندر رہتے ہوئے جمہوری نظام کو اسلامیانے کی کوشش کریں گے اور چونکہ پاکستانی عوام اصولی طور پر غلبہ اسلام چاہتے ہیں، اس کے لیے ہم تطہیر افکار کریں گے اور لوگوں کو یہ باور کرادیں گے کہ پاکستان لے لیے دیانت دار قیادت ناگزیر ہے اور جدوجہد کی بنیاد پر ہم خیانت دار قیادت کو اکھاڑ پھینکیں گے۔ اس کے لیے ایکطرف علماء نے رائے عامہ کی ہمواری کے لیے تن من دھن سے کام کیا اور دوسری طرف علماء اکرام کے ساتھ مل کر دستور پاکستان میں اسلامی شقیں شامل کرانے کی بھرپور جدوجہد کی۔ اس نظریاتی ماڈل پر کام کرنے کا ثمر یہ ہے کہ ہم نے دستور میں چند اسلامی شقیں شامل کروادیں جو فی العمل معطل رہتی ہیں، تمام قوانین غیر شرعی نہ صرف برقرار ہیں بلکہ ان میں مسلسل اضافہ ہو رہا ہے اور دوسری طرف انتھک کوششوں اور جدوجہد کے باوجود ہم رائے عامہ کو نہ غلبہ اسلام کے لیے ہموار کرسکے اور وہ اس بات پر تیار نہیں کہ وہ سیکولر حکمرانوں سے چھٹکارا پائیں اور منصب اقتدار دین دار قیادت کو سونپ دیں۔ ساٹھ سال کا تجربہ ہمیں بتاتا ہے کہ لوگوں کی دلی وابستگیاں اب بھی سیکولر پارٹیوں کے ساتھ ہی ہیں۔"(5)

یوں یہ بات عیاں ہوتی ہے کہ پاکستان کا آئین مکمل طور پر اسلامی نہیں ہے اور جو کوششیں اسلامی قوانین لانے کے لیے کی جاتی ہیں وہ ناکام ہو جاتیں ہیں کیونکہ صاحب اقتدار قوتیں لادینی ذہن رکھتیں ہیں اور ان کے زندگی گزارنے کا نظریہ علماء کے نظریہ سے ہم آہنگ بھی نہیں ہے۔ علماء اور لادینی قوتوں میں یہ کشمکش قیام پاکستان کے بعد سے اب تک جاری ہے۔ مثلاً عزیز احمد اپنی کتاب میں لکھتے ہیں،

"1953 میں یہ فساد(مراد احمدیوں کے خلاف تحریک ختم نبوت اور پنجاب میں مارشل لاء کا نفاذ ہے) ایک ایسی حکومت کے درمیان، جو مغربی لادینی تصور کو مبنی بر حقیقت سمجھ رہی تھی، اور روایاتی اور اساسیت پسند علمائ کے مابین جو پاکستان میں ایک مذہبی ریاست دیکھنے کے متمنی تھے، وقوع پزیر ہوا۔ اس کی جامع و دقیق تحلیل جج محمد منیر اور جج ایم آر کیانی نے اپنی رپورٹ جو عام طور پر 'منیر رپورٹ' سے موسوم کی جاتی ہے۔ اس رپورٹ میں موجودہ دور میں ایک 'اسلامی ریاست' کے تصور کے مسئلہ اور الجھن کو بڑی سچائی اور ایمانداری سے پیش کیا گیا۔ اگر پاکستان، علماء یا اساسیت پسندوں کی تعریف کے تحت ایک اسلامی ریاست کہا جاسکتا ہے تو جدید معنوں میں اس جمہوریت نہیں کہا جاسکتا ہے۔ تیکنیکی لحاظ سے اگر اختیار اعلیٰ خدا کو سونپ دیا جاتا ہے تو پھر مقتدر و بااختیار ریاست نہیں کہی جاسکتی۔"(6)

مذکورہ بالا بات کو اگر سامنے رکھا جائے تو یہ سمجھنا مشکل نہیں کہ پاکستان میں جمہوری نظام کے سبب پارلیمنٹ میں پہنچے والے قوانین بنانے اور اس کی تشریح کرنے میں کلی حیثیت رکھتے ہیں چنانچہ ایوانوں میں سیکولر اور مغربی اداروں سے تعلیم حاصل کرکے آنے والوں کی اکثریت کے سبب قانون بنانے اور ان کی تشریح کرنے میں ان کی ہی مرضی چلتی ہے یوں اکثر دین کے معاملوں پر ان لادینی نظریات رکھنے والوں اور دینی قوتوں میں ٹکراو پیدا ہو جاتا ہے جیسا کہ منیر رپورٹ کے حوالے میں بات کہی گئی۔ یہ کوئی آخری موقع نہیں تھا بلکہ یہ سلسلہ جاری ہے۔ 2016 میں جب دہشت گردی کی عدالت کے سربراہ جسٹس پرویز علی شاہ(جو ممتاز قادری کے خلاف دہشت گردی کے مقدمے کی سماعت

کر رہے تھے انھوں) نے دلائل سننے کے بعد کہا کہ اسلامی قانون کے تحت تو آپ کو سزائے موت نہیں دی جاسکتی مگر انسداد دہشت گردی کے ملکی قانون کے تحت آپکو یہ سزائے موت دی جارہی ہے۔(7)

اسی طرح ایک اور جج کا فیصلہ کچھ ایسی ہی کہانی بیان کرتا ہے کہ جب چیف جسٹس تصدق حسین جیلانی نے اپنے ایک فیصلے میں قرار دیا کہ منشور انسانی حقوق کی بنیاد پر ہر فرد کو ارتداد کی آزادی حاصل ہے اور ہر شخص اپنا مذہب تبدیل کر سکتا ہے۔(خالد جامعی سید، ص117)۔ منشور انسانی حقوق کی طرح ایک اور لادنی نظریہ 'مغربی تصور آزادی' بھی دنیا بھر میں رائج ہے جس کے تحت کسی بھی شخص کی آزادی اظہار رے پر پابندی عائد نہیں کی جاسکتی۔ یہ نظریہ بھی مذہبی تصور کے برعکس ہے۔ جب لیبیا میں قرآن اور توہین رسالت کے خلاف ایک مظاہرے کے دوران مشتعل مظاہرین نے امریکی ایمبیسی پر حملہ کرکے آگ لگادی اور کچھ امریکی اس میں ہلاک ہوگئے تو اقوام متحدہ کا اجلاس طلب کیا گیا جس میں خطاب کرتے ہوئے امریکی صدر اوبامانے کہا کہ توہین قرآن اور توہین رسالت آزادی اظہارے رائے کی ایک شکل ہے۔ امریکی آئین اس آزادی کا تحفظ کرتا ہے، آزادی اظہارے رائے پر پابندی نہیں لگائی جاسکتی۔ دنیا کے سب لوگ آزادی کے الحق اور الخیر ہونے کے اصول کو تسلیم کرتے ہیں لہذا ہر شخص کو اظہارے رائے کی آزادی حاصل ہے۔(8)

یہی وجہ ہے کہ پاکستان میں جب بھی توہین رسالت کے واقعات ہوئے تو عالمی برادری کا دباؤ پاکستان پر آگیا اور ہمارے ایوانوں میں بیٹھے ہوئے لوگ بھی ذہنی طور پر تقسیم ہوگئے۔ ایسا بھی دیکھنے میں آیا کہ جب لوگ نظریاتی طور پر دو حصوں میں تقسیم ہوگئے۔

ان تمام تر واقعات اور حالات کا جائزہ لیا جائے تو یہ بات عیاں ہوتی ہے کہ پاکستان کے ایوانوں اور عدلیہ جیسے اہم اداروں میں جہاں قانون سازی ہوتی ہے یا اس کی تشریح ہوتی ہے وہاں بیٹھے ہوئے لوگوں کی غالب اکثریت وہ ہے جو سیکولر تعلیمی اداروں سے تعلیم حاصل کرکے آئی ہے، ان میں وہ تعداد بھی شامل ہے کہ جنھوں نے خود مغربی تعلیمی اداروں سے تعلیم ہی حاصل نہیں کی بلکہ وہاں کے کلچر میں بھی وقت گذارا، نیز وہ مغرب کی ترقی سے بھی شدید متاثر ہوئے چنانچہ ان کے ذہن اور نظریات مغرب کے کلچر اور نظریات سے متاثر یا کسی حد تک ہم آہنگ ہوگئے۔ اب ایسے لوگوں کی خواہشات بھی ایسی ہونے لگیں کہ اس ملک کو بھی اسی مغربی ڈگر پر لے جایا جائے۔ یوں دیکھا جائے تو اس ملک کی پالیسوں پر اثرانداز ہونے والا طبقہ روایتی نظریات بھی نہیں رکھتا نہ ہی انھیں سمجھ سکتا ہے جبکہ ملک کا اکثریتی طبقہ خاص کر علماء اکرام جو دینی نقطہ نظر رکھتے ہیں ان کے لیے یہ قابل قبول نہیں ہے کہ ان کے ہوتے ہوئے اس ملک میں لادینی نظریات کو رائج کیا جائے یا قانونی شکل دی جائے چنانچہ حکمران اور پالیسی بنانے والے طبقے اور دینی نظریات رکھنے والے طبقے میں ایک کشمکش اور جنگ کی سی کیفیت اس ملک میں نظر آتی ہے چونکہ ملکی آئین بھی جمہوری طرز کا ہے کہ جس میں عددی برتری نہایت اہم ہوتی ہے خاص کر قانون سازی کے لیے، اور یہ برتری ان لوگوں کو حاصل ہے جو سیکولر تعلیمی نظام سے نکل کر آئے ہیں لہذا دینی قوتوں کو اسلامی اعتبار سے ہر محاذ پر شکست کا سامنا کرنا پڑتا ہے چونکہ سرکاری ملازمتوں کے لیے موجودہ سیکولر ادروں کی اسناد لازمی ہوتی ہیں لہذا ملکی سرکاری ادروں کو چلانے والوں میں وہی نظریات کم وبیش موجود ہوتے ہیں جو کسی مغربی سیکولر تعلیمی ادروں سے تعلیم حاصل کرنے والوں کے ہوتے ہیں، یوں ملکی مشینری پر لادینی نظریات کے اثرات رکھنے والوں کی ایک

بڑی تعداد ہوتی ہے، اس طرح وہ جگہ جہاں سے اس ملک میں قرآن وسنت کے قوانین گزر کر لاگو ہوسکتے ہیں وہاں مخالف نظریات رکھنے والوں کی بڑی تعداد موجود ہوتی ہے۔ نظریاتی اعتبار سے اوپر کی سطح پر یہ فرق بہت بڑھ چکا ہے اور اس میں اضافہ ہو رہا ہے اور یہی فرق ملک میں اس کشمکش کو بڑھا رہا ہے جو دینی اور لادینی سوچ رکھنے والے گروہ کے مابین ہے۔

دوسری طرف سیکولر تعلیمی اداروں سے بڑھ کر میڈیا سیکولر اور لادینی نظریات کا پرچار کرتا ہے اور لوگوں کے ذہن کو متاثر کرتا ہے لہذا یہ اثر بھی دینی قوتوں کے خلاف جاتا ہے۔ پاکستان میں اکثر مواقعوں پر جب دینی قوتوں نے اپنے نظریات پر سمجھوتہ نہ کرتے ہوئے ریاست پر سخت دباؤ ڈالا تو میڈیا نے ان تمام مواقعوں پر دینی قوتوں کے بجائے ریاست کو چلانے والی لادینی اور سیکولر قوتوں کا ساتھ دیا۔ مثلاً جب ممتاز قادری کو پھانسی دی گئی تو علماء نے ممتاز قادری کو شہید قرار دیا اور عوام سے جنازے میں شرکت کی درخواست کی۔ یہ جنازہ اس قدر بڑا تھا کہ قتل ہونے والے گورنر پنجاب سلمان تاثیر کے بیٹے نے انگریزی اخبار میں کالم لکھا کہ جنازہ میں ایک لاکھ کے قریب افراد شریک تھے اور یہ پاکستان کی تاریخ کے چند بڑے جنازوں میں سے ایک تھا۔(9)

اس بڑے جنازے کو پاکستانی میڈیا نے مناسب کوریج نہ دی جس پر معروف برطانوی نشریاتی ادارے بی بی سی کا کہنا تھا کہ ایسا پرامن میڈیا شاید پہلی مرتبہ پاکستانی ناظرین کو دیکھنے کو ملا، پھانسی کی خبر پر نہ تو طویل تجزیوں کے لیے سنیئر نامہ نگاروں اور تجزیہ نگاروں کو ان کے بستروں سے اٹھایا گیا اور نہ ہی ڈی ایس این جیز چلانے والوں کو زیادہ مشکل میں ڈالا گیا، وہ چینل جو چند افراد کے مجمع کو گھنٹوں کوریج دینے سے نہیں تھکتے تھے، اس مرتبہ بالغ نظری کا مظاہرہ کررہے تھے، اگر لاہور اور اسلام آباد کی شاہراہوں کو احتجاج کرنے والوں نے بند بھی کیا تو اس خبر کی اوقات محض ایک ٹکر تک ہی رکھی۔(10)

وائس امریکہ نے اپنی رپورٹ میں کہا کہ ممتاز قادری کی پھانسی کے بعد پاکستان کے الیکٹرونک میڈیا میں غیر معمولی طور پر خاموشی چھائی رہی جبکہ بیشتر اخبارات نے بھی اس کو شہہ سرخی کے بجائے تین کالمی خبر کے طور پر چلایا۔ تاہم ممتاز قادری کی پھانسی کے بعد نہ تو بڑے نجی ٹی وی چینلز نے اس خبر کو تفصیلی طور پر پیش کیا اور نہ ہی اس کے خلاف ہونے والے مظاہروں کی لحہ بہ لحہ خبریں پیش کیں جو بظاہر ایک غیر معمولی بات ہے۔(11)

ممتاز قادری کے واقعہ کے علاوہ توہین رسالت کے دو مزید واقعات (آسیہ بی بی اور مشال کیس) میں بھی میڈیا کا کردار قدر مختلف نہ تھا۔ علماء اور دینی طبقے کی جانب سے ان تینوں واقعات میں میڈیا کے کردار پر سخت تنقید کی گئی جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ پاکستانی میڈیا نظریاتی طور پر مذہبی طبقے سے ہم آہنگ نہیں ہے بلکہ اس کا اپنا ایک لبرل تشخص ہے اور یہی وجہ ہے کہ سیکولر تعلیمی اداروں کے ساتھ ساتھ پاکستان میں میڈیا بھی لوگوں کو اس طرف لے کر جا رہا ہے جس سے دینی طبقات اختلاف رکھتے ہیں۔ یوں اس جائزے سے یہ بات عیاں ہوتی ہے کہ پاکستان پارلیمنٹ، عدلیہ اور دیگر بڑے اداروں میں بیٹھے ہوئے اور سیکولر تعلیمی اداروں سے نکلے والے لوگوں کے علاوہ میڈیا سے متاثر لوگوں کی ایک تعداد اس نظریاتی راستے سے قطعی الگ ہے جو اس ملک کے علماء اور دینی طبقہ کا نظریاتی راستہ ہے، راستے کا یہی فرق پاکستان میں دینی اور لادینی

قوتوں کے درمیان کشمکش کا باعث ہے جو دن بہ دن بڑھتی جارہی ہے، اس کشمکش کو کنٹرول کرنا ہے تو پھر اس نظریاتی فرق کو بھی کم کرنا ہوگا، یہ فیصلہ کرنا ہوگا کہ علماء کی رائے مانتے ہوئے اس ملک کے قانون سازی اور اس کی تشریح سے متعلق بڑے فیصلے کرنا ہیں یا کہ ان بڑے اداروں میں بیٹھے ہوئے دوسرے نظریاتی گروہ کے فیصلے قبول کرنا ہیں؟

یہ کشمکش اس وقت تک بڑھتی رہے گی جب تک کہ یہ فیصلہ نہ کرلیا جائے کہ ہم نے اپنے ملک میں سب سے اعلیٰ اختیار کس کو دینا ہے؟ منتخب ہو کر آنے والے لوگوں کو اور ان کے طے کردہ اصولوں کو یا جو علما چاہتے ہیں یعنی اسلامی اصولوں کو۔اسی طرح جب تک دونوں گرہوں یعنی علماء، دینی طبقے اور سیکولر نظام تعلیم و میڈیا کسی ایک سوچ اور نظریات کو قبول نہیں کرلیتے یا کم از کم پارلیمنٹ اور عدلیہ جیسے اداروں میں علماء اور دینی طبقے کی اکثریت نہیں آجاتی، یہ کشمکش ختم نہیں ہوسکتی۔

حوالاجات

(1)جاوید اکبر انصاری ڈاکٹر، سرمایہ دارانہ عقائد و نظریات، وراثت پبلی کیشنز، لاہور، 2014، ص 39

(2)محمد زاہد صدیق مغل مولانا، اسلام یا جمہوریت، اسلامی خلافت اور موجودہ مسلم ریاستوں کا تاریخی تناظر میں موازنہ، کتاب محل ، لاہور، 2016، ص 8

(3)محمد زاہد صدیق مغل مولانا، ایضاً ص 187

(4)عبد الواہاڈاکٹر، اسلام یا جمہوریت، اسلامی انقلاب اور لبرل دستوری جدوجہد، کتاب محل، لاہور، 2016، ص 143

(5)جاوید اقبال، اسلام یا جمہوریت، اسلامی نظام اور اسلامی انقلاب، کتاب محل، لاہور، 2016، ص 129

(6)عزیز احمد، برصغیر میں اسلامی جدیدیت، ادارہ ثقافت اسلامیہ، لاہور، 1997، ص 242

(7)خالد جامعی سید، ماہنامہ البرہان، قانون توہین رسالت کا اطلاق، غامدی صاحب کے موقف کا علمی جائزہ، لاہور،، مارچ 2016، ص 85۔

(8)خالد جامعی سید، ایضاً، ص 87۔

(9)http://www.nytimes.com/2016/03/13/opinion/sunday/my-fathers-killers-funeral.html?_r=0

(10)http://dailyaghaz.com/story/77886

(11)http://www.urduvoa.com/a/pakistani-media-give-a-muted-coverage-of-mumtaz-qadris-hanging/3214349.html